سرسید، مولانا آزاد اور علی گڑھ

پروفیسر اصغر عبّاس

'گلشن دوست'، سرسید نگر، سول لائنس، علی گڑھ۔202002 (یوپی)

مولانا ابوالکلام آزاد کا علی گڑھ سے جو بھی سیاسی اختلاف رہا ہو، یہاں اسے زیر بحث نہیں لایا گیا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مولانا نے اپنے ابتدائے شعور سے پایان عمر تک علی گڑھ سے بہت مضبوط رشتہ قائم کر رکھا تھا اس میں سرسید کے افکار بھی ہیں، علی گڑھ تحریک کے عناصر خمسہ کے بزرگ بھی ہیں اور وہاں کے نمائندہ اراکین بھی۔

مولانا آزاد نے قدامت کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ان کے والد اپنے علاوہ دنیا میں صرف دو آدمیوں کو پورا مسلمان سمجھتے تھے اس فضا میں مولانا پروان چڑھے اور ان کی فکری کشمکش کا آغاز ہوا۔ جلد ہی ان کا رابطہ مصنف گلِ صد برگ خان بہادر شمس العلما مولوی محمد یوسف رنجور عظیم آبادی سے ہوا یہ خانوادۂ صادق پور کے چشم و چراغ علی گڑھ کالج کے ممتاز طالب علم سرسید کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ قرین قیاس ہے کہ انہی کے توسط سے مولانا کو سرسید کی تصانیف کا شجر سایہ دار ملا۔ مولانا کے گھریلو ماحول کو دیکھتے ہوئے سرسید کی کتابوں کے مطالعہ کی اجازت کا سوال ہی نہیں تھا اس لیے جب گھر کے لوگ سو جاتے تو ان کتابوں کے مطالعہ میں مولانا راتوں کو صبح کر دیا کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''رمضان کا مہینہ تھا عشا کے بعد مطالعہ شروع کرتا اور ڈھائی بجے رات میں جب ماما سحری کے لیے اٹھانے آتی تو مطالعہ موقوف کرتا'' افکار سرسید کی یہی کشش تھی جو انہیں شیخ غلام محمد مالک اخبار وکیل تک لے گئی ان سے مولانا کے تعلقات اس بنیاد پر استوار ہوئے کہ وہ سرسید کو نابغۂ روزگار سمجھتے تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جب وہ پہلی مرتبہ مجھ سے ملے تو کہا ''سچ ہے اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو سرسید کا دماغ تو نبوت کا دماغ تھا'' یہ سن کر مولانا بہت مسرور ہوئے۔ یہی زمانہ تھا جب حالی کی حیات جاوید چھپ کر آئی جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل سرسید کی سوانح عمری ہے اسے مولانا آزاد نے دو راتوں میں پڑھ ڈالا اور اس خوف سے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا کہ اتنی دیر حیات جاوید کے مطالعہ سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کتاب پر جب غبار خاطر اور کاروان خیال کے مکتوب الیہ نے جنہیں سرسید نے با اختیار خاص علی گڑھ کالج کا ٹرسٹی نامزد کیا تھا ایک سخت تبصرہ کیا جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپنے کے علاوہ مولانا شبلی کی ایما پر کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔ اس تبصرہ کا مُسکت جواب دیتے ہوئے مولانا آزاد نے لکھا کہ

''جو حیات جاوید پر نظر ڈالے گا وہ حضرت بھیکم پوری کی قوت ایمانی پر تعجب سے پکار اٹھے گا کہ جسے حضرت بھیکم پوری ظلمات کا دیو ثابت کر رہے ہیں وہ ہی نورانیت کا مقدس فرشتہ نظر رہا ہے۔'' سرسید کی حمایت میں انہوں نے اس دوران علم کلام پر ایک کتاب لکھنے کا ڈول بھی ڈالا تھا جو مولانا کے بعض اور کاموں کی طرح ادھورا رہا۔ اس سلسلے میں مولانا لکھتے ہیں ''جدید علوم کے مقابلے میں تجدید علم کلام کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں ان میں سب سے پہلی کوشش وہ ہے جو اب سے بتیس برس پیشتر سرسید کی مذہبی تحقیقات سے ظاہر ہوئی۔ سرسید کے بعد اگرچہ اس ضرورت کو اور لوگوں نے بھی محسوس کیا ممالک اسلامیہ میں متعدد کتابیں لکھی گئیں، لیکن درحقیقت اس پر کوئی مفید اضافہ نہ ہو سکا۔'' سرسید سے عقیدت کی اس کیفیت کا اندازہ ۱۹۴۹ء میں بھی ہوتا ہے جب مولانا یہ فرماتے ہیں کہ ''میرا خیال پہلے بھی یہی تھا اور اب بھی یہی ہے کہ سرسید مرحوم کی شخصیت انیسویں صدی کی عظیم ترین شخصیت تھی۔''

مولانا آزاد پر سرسید کے اثرات کے سلسلے میں اولین اہمیت اس مذہبی فکر کو حاصل ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کے صدیوں سے تقلید اور مذہب کے رسمی تصور سے جکڑے ہوئے ذہن کو آزاد کرنے اور اس میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مولانا غبار خاطر میں لکھتے ہیں کہ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک وشبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد وافکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندانی تعلیم نے چنی تھیں بیک دفعہ متزلزل ہو گئیں''۔ بے اطمینان کی اس منزل میں سرسید کی تحریروں نے مولانا کو اسلام کی حقانیت کا راستہ دکھایا وہ فرماتے ہیں کہ ''سرسید کی تحریروں نے ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا۔'' یہ دنیا وہ تھی جس میں سرسید نے بتایا تھا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو انسانی زندگی کے ہر تقاضے کو پورا کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کی روح کو سمجھا جائے۔ سرسید کا خیال تھا کہ قانون فطرت درحقیقت خدا کا فعل ہے اور جو مذہب فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہوگا وہ خدا کا قول ہوگا۔ پس اس کے فعل اور اس کے قول میں مطابقت ہونی لازمی ہے اور یہ بات کہہ کر سرسید نے اسلام کی صداقت کا ایک اور ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ سرسید کے وسیلے سے مولانا نے

امام غزالی کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا وہ لکھتے ہیں: ''سب سے پہلے سرسید کے اس ریویو سے جوانہوں نے امام صاحب کے دس رسالوں پر لکھا۔ مجھے امام غزالی کی تصانیف کا شوق ہوا''۔ انھوں نے امام صاحب کی کتاب تہافتہ الفلاسفہ کا ترجمہ بھی شروع کیا غالباً اسی زمانہ میں مولانا کا تعلق بنگال کی انتہا پسند سیاسی جماعتوں سے ہوا اور اس کتاب کا ترجمہ رہ گیا۔ اسی زمانہ میں انہیں سرسید کی مذہبی فکر سے کچھ اختلاف ہوا جس کا واضح اظہار نہیں ملتا ممکن ہے حقائق کے ادراک میں سرسید جس منزل پر تھے اسے مولانا اس حد تک نہ تسلیم کرتے ہوں، لیکن مولانا کی مذہبی فکر کے ایک عمومی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر جس منزل کی طرف رہنمائی کرتی ہے سرسید کی مذہبی فکر اس کی اولین منزل ہے ان دونوں میں وہ تفاوت نہیں ہے جو دو مخالف سمتوں میں ہوتا ہے بلکہ وہ نسبت ہے جو ایک ہی سمت کی اولین اور سابقہ منزلوں میں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اختلاف کے باوجود مولانا سرسید کی عقلیت پسندی سے کلیتاً کبھی دست بردار نہیں ہوئے۔ مولانا آزاد ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں کہ ''انسان کے لیے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر اور باہر جو کچھ محسوس کر سکتا ہے، اس سے تفکر اور تدبر کرے۔ چنانچہ قرآن کی کوئی سورت اور سورت کا کوئی حصہ نہیں جو تفکر اور تعقل کی دعوت سے خالی ہو'' مولانا کا عقلیت پر یہی زور سرسید کی پوری تحریک کا نقطہ ماسکہ ہے۔

المصباح سے لے کر پیغام تک مولانا آزاد کا واسطہ کئی اخبارات و رسائل سے رہا ہے ان سب پر سرسید کا پرتو ہے ان میں الہلال کی نثر کو چھوڑ دیجئے کہ اس میں نثر کا وہ جوہر نہیں جو گزٹ اور تہذیب الاخلاق کا طرۂ امتیاز ہے اور سیاسی معاملات میں وہ دھیما پن نہیں جس سے سرسید کے صحائف عبارت ہیں باقی رہا یہ سوال کہ ایک صحافی کو خوف و مصلحت سے بے نیاز ہو کر اپنا فرض ادا کرنا چاہیے اس کی پہلی مثال ہمیں گزٹ سے ملتی ہے جس میں سرسید اپنے اس اعلیٰ اصول صحافت کا اعلان اس وقت کرتے ہیں جب بقول نٹ راجن ''لکھنؤ اور دہلی کے محاوروں کی ایک دوسرے پر برتری کا اظہار بھی خطرے سے خالی نہیں تھا اس وقت گزٹ کا سرنامہ اس عبارت سے مزین ہوتا تھا Liberty of the Press is a A Prominent duty of the Govt.And Natural right of the subjects. یہی وہ حرف راز تھا جس نے مولانا آزاد کے دل میں سیاسی شعور کو ابھارا۔ مولانا نے جب اپنے اخبارات و رسائل نکالے تو سیاسی شعور کا وہ تخم جسے آزادیٔ فکر کہتے ہیں وہ انگریزی علوم کے سبب ایک تناور درخت بن چکا تھا اس وقت تک ہمارے ملک میں جوش و ہیجان کے وہ ادارے سامنے آ گئے تھے جنھیں جلسہ جلوس کہتے ہیں اور ہم حالات کی ایک نئی گرفت میں تھے اور سرسید کا وہ مسلک جو انھوں نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں پیش کیا تھا اور جس کی تقلید سے مولانا کے ہم کیش وقت کی رفتار کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے اب نئی الجھنوں کو دعوت دے رہے تھے۔ اس کے متعلق یوم سرسید سے ایک دن قبل ۱۶ / اکتوبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں مولانا نے سرسید کا مضمون آزادیٔ رائے اس نوٹ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا کہ ''۱۸۸۱ء میں سرسید مرحوم نے ایک نہایت مفید اور دلچسپ مضمون آزادی رائے پر لکھا تھا ہم بہت ضروری سمجھتے ہیں کہ آج کل وہ لوگ جو سید صاحب کے اتباع و تقلید کے مدعی ہیں اور ان کے سجادہ و پیشوائی کا اپنے تئیں وارث قرار دیتے ہیں اس مضمون کو غور سے پڑھیں اور سوچیں کہ قوم کی جس آزادی رائے کے ولولے کو وہ دبانا چاہتے ہیں اس کے متعلق ان کے رہنمائے اول کی کیا تعلیم ہے۔'' تہذیب الاخلاق اور الہلال میں قدر مشترک آزادی رائے کے علاوہ دونوں کا اصلاحی جذبہ ہے دونوں ہی اپنے ہم کیشوں کو دعوت دینے نکلے تھے دونوں نے صحافت کو ایک مشن کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ دونوں قرآن و حدیث کے حوالوں سے بھرے ہوئے ہیں دونوں نے ٹائپ کا استعمال کیا حالانکہ اکبر الہٰ آبادی کہتے ہیں:

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈ ورڈ کی دہائی ہے

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ ''عوام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات تہذیب الاخلاق نے چھوڑے ہیں ہندوستان کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے دور جدید کے بلند معیار مصنفین نے اسی خوان نعمت سے لقمے چنے اور اس حلقہ کے اثر و نفوذ سے نقد و بصر کی نئی قدریں اور فکر و نظر کے نئے نئے زاویے متعین ہوئے۔''

کہا جاتا ہے کہ مولانا آزاد خوش وضع تھے، روشن جبیں تھے، خطابت کے ہر رمز کے شناسا تھے، اسٹیج پر آتے تو آنکھوں کو اچھے لگتے، بولتے تو فردوس گوش اور تقریر جیسے جیسے آگے بڑھتی دماغ مولانا کے حق میں دست بردار ہوتا جاتا تھا۔ مولانا کے اس فن خطابت کا پہلا مدرسہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اسٹیج تھا، اردو خطابت کا آغاز سرسید کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے آگرہ کی جامع مسجد کو واگزار کرنے کے موقع پر ۱۸۵۹ء میں کی تھی۔ اس مسجد ہی کو نہیں کئی مسجدوں کو ۱۸۵۷ء کے آشوب میں انگریزوں نے ضبط کر لیا تھا اور سرسید کے تدبر کے طفیل ان میں نماز کی اجازت ملی تھی۔ جامع مسجد کی سرسید کی یہ تقریر نہ صرف ان کی بہترین قوت فیصلہ، تیزی ذہانت اور سلاست بیان کا اچھا نمونہ ہے بلکہ اس تقریر سے اس عشق رسولؐ کا بھی اظہار ہوتا ہے جس نے سرسید کی زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین کا

علامیہ بنادیا تھا۔ سرسید نے جب مولانا آزاد کی پیدائش سے تین سال پہلے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی تو جلد ہی مقرروں کی ایک ایسی کھیپ تیا رہوگئی جس کا اس سے پہلے وجود نہ تھا اور اگر تھا بھی تو ہم انھیں واعظوں کے زمرہ میں رکھیں گے ۔ مولانا آزاد کا تعلق کانفرنس سے تھا اور اس کے اٹھائیسویں اجلاس تک رہا۔ جس میں انھوں نے کانفرنس کے ضوابط کے خلاف ایک سیاسی تقریر کی اور اس کے بعد کانفرنس کا پلیٹ فارم مولانا کے لیے ارض ممنوعہ بن گیا، لیکن اس کے قبل تک مولانا کانفرنس سے عملی دلچسپی لیتے رہے۔ ۱۹۰۳ء کے لسان الصدق میں مولانا لکھتے ہیں کہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلما نے اصلاح تمدن اور اصلاح مراسم پر توجہ شروع کر دی ہے، لیکن جو عملی کارروائی کانفرنس نے شروع کی ہے وہ واقعی قابل توجہ ہے۔ انہی ضرورتوں کو دیکھ کر لسان الصدق کے مقاصد میں کانفرنس کے مقاصد بھی داخل کئے گئے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں جب علی گڑھ میں کانفرنس کا اجلاس ہوا جس کی مجلس استقبالیہ کے صدر حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے اس کے تیسرے اجلاس میں مولانا آزاد نے سندھ کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت زار پر تقریر کی۔ ۱۹۱۲ء میں کانفرنس کے اجلاس میں جن لوگوں کو ڈائس پر جگہ ملی تھی ان میں مولانا آزاد بھی تھے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب ہمارا ملک سیاسی تحریکوں سے آگاہ ہوا تو مولانا نے اپنے خصائص اور محاسن سے اردو خطابت کے میدان کو خاصا وسیع کر دیا اور وہ بیسویں صدی کے صف اول کے مقرروں میں شمار ہوئے، لیکن انھیں خطابت کے میدان میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات کا اعتراف رہا مولانا لکھتے ہیں کہ ''اردو خطابت کی تربیت گاہ دراصل یہی کانفرنس ہے اس کی آغوش میں وقت کے بلند پایہ ارباب ادب کی خطیبانہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں اس کانفرنس کے پلیٹ فارم نے انہیں عوام سے متعارف کرایا اور یہیں حقیقت میں ان کی شخصیت کے دبے ہوئے نقوش ابھرے۔''

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا شروع میں دائرۂ عمل محدود تھا، لیکن دھیرے دھیرے اس کے دائرۂ کار کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ مثلاً شعبہ ابتدائی تعلیم و مدارس اردو شعبۂ ثانوی تعلیم شعبۂ اعلیٰ تعلیم شعبۂ تعلیم نسواں شعبۂ مدارس اسلامی شعبۂ تعلیم بالغان شعبۂ معاشیات واصلاح معاشرت شعبۂ پریس شعبۂ ٹیکنیکل تعلیم شعبۂ اسلامی علوم وفنون اس کانفرنس میں ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کا اضافہ کیا گیا تھا کہ اس وقت تک اردو کی ترقی اور استحکام کے لیے کوئی مستقل اور منظم طریقہ نہیں اختیار کیا گیا تھا جبکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے لیے نہایت سرگرم اور مفید کوششیں کی جارہی تھیں مثلاً پونا میں مرہٹی زبان بنارس میں ہندی کے لیے اور کلکتہ میں بنگالی کی ترقی کے لیے زر کثیر صرف کیا جارہا تھا، اردو کا خانہ خالی تھا۔ مولانا آزاد نے ۱۹۰۳ء کی کانفرنس میں انجمن ترقی اردو کے لیے اپنی خدمات یہ کہہ کر پیش کیں کہ وہ عربی و فارسی میں ترجمہ کرنے یا کتاب لکھنے کے لیے تیار ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں جب شبلی انجمن ترقی اردو کی نظامت سے سبکدوش ہوئے اور یہ بار مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو سونپا گیا تو کانفرنس کے اجلاس ہفتم میں خواجہ غلام الثقلین نے نظامت کے لیے حبیب الرحمٰن خاں کے نام کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ'' میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ چند خاص معاون مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب کے ہوں۔ میں ابو الکلام محی الدین صاحب، آزاد اور خواجہ غلام الحسنین صاحب اور سید امجد علی کے نام پیش کرتا ہوں۔ یہ ایسے ذی لیاقت اصحاب ہیں جو ہمارے حبیب الرحمٰن صاحب کا ہاتھ اس مفید کام میں بٹا سکتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ حتی الوسع اس میں دریغ نہ کریں گے۔'' مولانا آزاد نے کہا کہ'' خیال کیا جاتا ہے کہ میں بھی اپنی خدمات سے اس شاخ کو کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہوں اگر یہ خیال صرف حسن ظن نہیں بلکہ صحیح ہے تو میں حاضر ہوں۔'' اور یہ کہنا کہ مولانا کو ۱۹۰۳ء میں اس کی مجلس عام میں شامل کیا گیا یا کچھ دنوں وہ انجمن کے اسسٹنٹ سکریٹری رہے درست نہیں ہے۔

علی گڑھ تحریک کے عناصر خمسہ کے کئی بزرگ مولانا آزاد کی غیر معمولی دماغی صلاحیتوں کے معترف ہی نہیں مداحوں میں تھے۔ بالخصوص شبلی جن کی قدر دانی مدح سے آگے نکل گئی تھی اغلب خیال ہے کہ مولانا آزاد سے شبلی کے روابط کی ابتدا ۱۸۹۹ء کے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کلکتہ سے ہوئی۔ اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے ایک ممبر مولانا آزاد کے دوست خان بہادر شمس العلما محمد یوسف رنجور تھے اسی کانفرنس میں سید امیر علی، رضا علی وحشت اور مولانا آزاد سے ملنے کے اشتیاق میں عبد الرزاق کانپوری بھی شریک ہوئے تھے جن سے بعد میں مولانا آزاد کی خط و کتابت رہی۔ شبلی نے اس کانفرنس میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے بی اے میں فارسی کو نصاب میں شامل رکھنے کی علی گڑھ کالج کے ہر دل عزیز پرنسپل جناب تھیوڈور ماریسن کی تجویز کی پر زور حمایت کی تھی۔ روایت ہے کہ جب کانفرنس میں شبلی تقریر کر رہے تھے تو حسن بیان کا یہ اثر تھا کہ سبحان اللہ کی صداؤں سے پورا ہال گونج رہا تھا ممکن ہے کہ نوعمر مولانا آزاد پر اس تقریر کا اثر ہوا ہو اور مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا ہو جس کے نشانات ہمیں ۱۹۰۱ء سے ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا آزاد کی ذہنی تربیت میں شبلی کا حصہ وافر ہے۔ یہاں یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہئے کہ مولانا آزاد نے شبلی کی وفات کے ایک عرصہ بعد یہ کہا ہے کہ ''شبلی کی ساری دماغی تربیت سرسید کے گوہر ریز اور گوہر خیز ذہن کا فیضان ہے'' اگر یہ درست ہے تو یہ بھی کہا جائیگا کہ مولانا آزاد کا ذہن بھی شبلی کے اثر سے سرسید کے ذہنی تجلیات سے روشن ہوا ہے۔ مولانا آزاد کو شبلی سے کس درجہ انس تھا اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جس میں مولانا لکھتے ہیں کہ'' بہ مشکل کوئی مہینہ ایسا گزرتا ہے کہ دو تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بہ دل نہ ہو جاتی ہو وہ کیا گئے کہ علم وفن کی صحبتوں کا

سرتاسر خاتمہ ہوگیا۔''

شبلی ہی نہیں مولانا آزاد ابتدا سے علی گڑھ تحریک کے کئی بزرگوں کی محبت کے تار میں بندھے ہوئے تھے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ محسن الملک مولانا حالی اور مولوی نذیر احمد کے ناموں میں میرے لیے خاص کشش پیدا ہوگئی تھی۔ نذیر احمد سے مولانا کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب الحقوق والفرائض تازہ تازہ چھپ کر آئی تھی، انھوں نے مولانا آزاد کو یہ کتاب دی اور کہا کہ اگر یہ کتاب مفید ہے تو پبلک کو اس کا مشورہ دو۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کتاب واقعی مفید تھی اور میں نے اس پر تبصرہ لکھ کر اخبار وکیل کو بھیج دیا۔ ۸/مئی ۱۹۱۲ء کو جب مولوی نذیر احمد کا انتقال ہوگیا اور ان کے ورثا نے علی گڑھ میں ان کی یادگار قائم کرنے کے لیے تجویز پیش کی تو مولانا آزاد نے الہلال ۱۹۱۲ء کے پانچویں شمارے میں اس کی پرزور تائید کی۔

سرسید کے تحریری اسسٹنٹ وحید الدین سلیم نے جب مولانا آزاد کا حالی سے یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ یہی لسان الصدق کے ایڈیٹر ہیں تو فرشتہ صفت حالی کو بڑی حیرانی ہوئی کیونکہ مولانا آزاد بہت کم عمر تھے۔ مولانا آزاد کو شروع سے حالی سے ارادت رہی ہے۔ ۱۹۰۳ء کے لسان الصدق میں انہوں نے اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ابھی تک قوم کی طرف سے حالی کا خاطر خواہ اعزاز نہیں ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں جب جدید اردو شاعری کے اس امام کو شمس العلما کا خطاب ملا تو مولانا آزاد نے دلی مسرت کا اظہار کیا اور عطائے خطاب کی تاریخ شائع کی جسے علی گڑھ کے سابق طالب علم محمد یوسف رنجور عظیم آبادی نے کہا تھا ریاض الاخبار گورکھپور میں جب داغ اور حالی کا موازنہ شروع ہوا تو مولانا آزاد نے لکھا کہ ''ان کی قومی فریادوں نے جو اثر پیدا کیا ہے وہی ان کی شاعری کی غایت ہے داغ اور جلیل کی ایک غزل لے کر حالی کے کلام سے مقابلہ کرنا سخت غلطی ہے۔'' ۱۹۱۲ء میں جب الہلال نکلا تو سرسید اور علی گڑھ تحریک کے شروع دن سے اس کے حامی اور مددگار اکبرالہٰ آبادی نے دعا دیتے ہوئے لکھا:

فروغ حق کو نہ ہوگا زوال دنیا میں
ہمیشہ بدر بنے گا ہلال دنیا میں

اور حالی نے مولانا آزاد کو لکھا کہ وہ الہلال کے مشرب سے متفق ہیں اور اس کی کامیابی کے خواہش مند، انہوں نے بڑے مزے کی یہ بات بھی کہی کہ ۱۸۹۰ء میں سرسید کی سیاسی پالیسی درست تھی اور اس زمانہ میں مولانا آزاد کا سیاسی رویہ بھی درست ہے۔ الہلال مولانا حالی کی خدمت میں پابندی سے جاتا تھا، لیکن ضعیفی کی وجہ سے اس ''صاحب باطن ولی'' کا لکھنا پڑھنا موقوف ہوگیا تھا اور اپنے طور پر وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب اس اخبار کی قلمی اعانت ان سے نہیں ہوسکتی تو اسے مفت کیوں لیا جائے۔ اس لیے وہ الہلال واپس کر دیا کرتے تھے۔ مولانا آزاد حالی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ''دفتر سے معلوم ہوا کہ الہلال کے جو پرچے خدمت عالی میں جاتے ہیں ویسے ہی واپس آجاتے ہیں میرے دل عقیدت کیش کے لیے تو اتنی نسبت ہی بہت ہے کہ آستانہ مبارک تک الہلال پہنچے اور محروم واپس آئے۔ تاہم اس بے التفاتی کا سبب معلوم کرنے کے لیے بے قرار ہوں۔ میں نے پیش تر ہی عرض کر دیا تھا کہ حاضری سے ارادت کیشوں کو نہ روکیے ردی کی ٹوکری میں تو آخر جگہ مل سکتی ہے۔'' ۱۹۳۵ء کو جب حالی کی یادگار قائم کرنے کے لیے پانی پت میں حکیم اجمل خاں کی صدارت میں جلسہ ہوا تو اس میں نواب حمید اللہ خاں آف بھوپال، مولانا آزاد اور اقبال بھی شریک ہوئے اور ان حضرات نے حالی میموریل فنڈ میں زر تعاون بھی دیا تھا۔

اس کے علاوہ علی گڑھ کالج کے کئی بزرگوں سے جن میں مولانا محمد علی، خواجہ عبدالمجید کالج میں عربی کے استاد عبدالحق حقی بغدادی مولانا کے حبیب صمیم مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور حسرت موہانی سے ان کے خصوصی مراسم تھے جب حسرت کا رسالہ اردوئے معلیٰ حکومت کی زد میں آیا تو مولانا آزاد نے مئی ۱۹۱۳ء کے الہلال میں لکھا کہ ''سید فضل الحسن حسرت موہانی کچھ عرصہ سے موجودہ سیاسی تحریکوں میں خاص طور پر حصہ لے رہے تھے علی الخصوص علی گڑھ اور بعض دیگر مقامات میں ان کی سعی مشکور سے ملکی صنعت و حرفت اور مصنوعات کی تحریک مسلمانوں میں جگہ پکڑ رہی تھی چونکہ یہ واقعہ ہز آنر کی اس شاہنشاہانہ اور مطلق العنان تہدید کے خلاف تھا اس لیے اس کو روکنے کے لیے ضروری تھا کہ حربۂ حکومت حرکت کرتا۔ چنانچہ رسالہ اردوئے معلیٰ سے یکا یک تین ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کی گئی ہے اور چونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا فقیر اور بوریہ نشین مالک تین ہزار کی جگہ دس روپے کے تین نوٹ بھی ایک وقت میں نہیں دے سکتا اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ پریس بند ہوگیا۔'' ۱۹۱۵ء کے البلاغ میں حسرت نے مولانا آزاد کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:

ارباب وفا پرست و حق کوش
تھا جس سے دیار صدق آباد

سب ہو گئے چپ بس ایک حسرت
گویا ہیں ابو الکلام آزاد

علی گڑھ سے مولانا ابوالکلام آزاد کا آخر دم تک گہرا رشتہ رہا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جب علی گڑھ لذت رفتار سے محروم ہوگیا تھا اس زمانے میں مولانا آزاد ہی اس کے آڑے وقت میں کام آئے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ ''مسلم یونیورسٹی کو ہر گزند سے محفوظ رکھنے میں مولانا نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ اس ادارے کی تاریخ میں کبھی فراموش نہ کی جائیں گی۔''

○○